# Surah Nisa (Ayat 146-154)

## *Fi Zilal Al Quran:*

146: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ○

البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں' ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا فرمائے گا

147: مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ○

آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے۔ اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے

(آیت) " نمبر ۱۴۴ تا ۱۴۷۔

یہ دوبارہ اہل ایمان کو پکار اور دعوت ہے اور یہاں پھر اس صفت اور لقب سے پکارا گیا جو ان کو انھیں اس وقت کے ماحول سے ممیّز کرتی ہے اور جس کی وجہ سے ان کا منہاج صاف' ان کا طرز زندگی اور ان کا طرز متمیز ہوتا ہے اور یہی وہ صفت ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور ہدایات الٰہیہ پر عمل کرتے ہیں۔

اس صفت اور لقب سے ان کو اس لیے پکارا جاتا ہے کہ منافقین کی راہ اختیار نہ کریں۔ اور وہ اس بات سے ڈریں کہ وہ اہل ایمان کو چھوڑ کر اہل کفر کو دوست بنائیں۔ یہ پکار اس لیے دی گئی کہ اس وقت اسلامی معاشرے کو اس کی اشد ضرورت تھی کیونکہ ابھی تک اہل ایمان اور اہل کفر مثلاً مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان مدینہ میں سماجی تعلقات موجود تھے اور بعض مسلمانوں اور کفار اہل قریش کے درمیان بھی بدستور تعلقات موجود تھے اگرچہ یہ تعلقات محض دینی طور پر ہوں۔ ہم نے بعض مسلمانوں کا اس لیے کہا ہے کہ بعض نے تو از خود اہل جاہلیت کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات توڑ لیے تھے یہاں تک کہ انھوں نے آباء اور ابناء کو بھی چھوڑ دیا تھا اور صرف اسلامی برداری تک اپنے آپ کو محدود کر لیا تھا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو تعلیم دی تھی۔

اور یہی وہ بعض لوگ تھے جن کو متنبہ کرنے کی ضرورت تھی کہ یہ تعلق رکھنا گویا نفاق کی راہ ہے اور یہ تنبیہ اس وقت کی گئی جب یہ کہ دیا گیا کہ یہ ہے تصویر ان منافقین کی۔ اور ان کو یہ بھی بتادیا گیا کہ اگر تم باز نہ آئے تو اللہ کے غصب اور انجام بد سے نہ بچ سکو گے۔

(آیت) "اتریدون ان تجعلوا اللہ علیکم سلطنا مبینا (۴ : ۱۴۴) (کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو) اہل ایمان کا دل تو اللہ کی پکڑ کی دھمکی اور اس کے عذاب کے اشارے ہی سے کانپ اٹھتا ہے' یہی وجہ ہے کہ یہاں بشکل استفہام ان کو متنبہ کیا گیا کہ اللہ کے عذاب سے ڈرو اور اپنے خلاف حجت قائم نہ کرو۔

ایک بار پھر جھنجوڑا جاتا ہے۔ لیکن بالواسطہ یعنی منافقین کے انجام بد کو دوبارہ دہرا کر کہ قیامت کے دن حال یہ ہوگا اور کس قدر خوفناک ہوگا۔

(آیت) "ان المنفقین فی الدرک الاسفل من النار ولن تجد لھم نصیرا"۔ (۴ : ۱۴۵) (یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے)

درک اسفل یعنی سب سے نچلا طبقہ' یہ اس صورت حال سے زیادہ مناسب ہے کہ دنیا میں وہز میں کی آلائشوں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے' اور سب سے نیچے تھے' اس طرح وہ قیامت میں بھی سب سے نیچے ہوں گے۔ دنیا میں بھی انھوں نے رفعت اور بلندی درجات حاصل نہ کی لہٰذا وہاں بھی ان کا یہی حال ہوگا یہ لوگ طمع' لالچ' ضعف اور حیرانی کا شکار تھے' اور اسی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ رکھ رکھاؤ اور اہل کفر کے ساتھ دوستی کرتے تھے اور انھوں نے یہ توہین آمیز موقف اختیار کیا ہوا تھا کہ نہ ادھر کے تھے اور نہ ادھر کے۔

دنیا میں اس انجام بد کے لیے انھوں نے کام کیا۔ آج وہ سب سے نچلے درجے میں ہیں۔ اب یہاں ان کا کوئی یار ومددگار نہیں ہے۔ اہل کفر کے ساتھ دوستی وہ مدد اور نصرت کی خاطر ہی تو کرتے تھے لیکن اب یہ لوگ کہاں مدد کر سکتے ہیں۔

ہاں توبہ کا دروازہ اب بھی کھلا ہے اور ان کے لیے موقع ہے کہ وہ باز آکر اخروی نجات حاصل کر لیں۔

(آیت) "الا الذین تابوا واصلحو واعتصموا باللہ واخلصوا دینھم للہ فاولئک مع المومنین وسوف یوت اللہ المومنین اجرا عظیما" (۴ : ۱۴۶) البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں' ایسے لوگ مومنوں (کے ساتھ ہوں گے اور اللہ عنقریب اہل ایمان کو اجر دیگا

دوسری جگہوں پر صرف اس قدر کہا گیا تھا۔

(آیت) "الا الذین تابوا واصلحو (۴ : ۱۴۶) اس لیے کہ توبہ اور اصلاح پذیری کے ضمن میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا جائے اور دین اللہ کے لیے خالص ہو جائے۔ لیکن یہاں توبہ' اصلاح اور اعتصام باللہ اور اخلاص دین کا بھی ذکر کیا گیا۔ اس لیے کہ یہاں بات ان

لوگوں سے ہو رہی تھی جو مذبذب تھے' منافق تھے' اور اللہ کے سوا اور لوگوں کے دوست تھے۔ چنانچہ یہاں توبہ واصلاح کے ساتھ خلوص دین اور اعتصام باللہ کا ذکر کیا گیا تاکہ یہ لوگ ڈانوڈول ایمان اور بودے کردار سے باز آجائیں۔ اس طرح اعتصام باللہ سے انھیں قوت ملے گی اور اخلاص سے انھیں نیت کی صفائی ملے گی۔ وہ دنیا میں بداعمالی کی گراٹوں اور آخرت میں آگ کے درجہ اسفل سے نجات پالیں گے۔ دنیا میں توبہ کرنے والے لوگ مسلمانوں اور صرف اللہ کی درگاہ سے عزت طلب کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور وہ دنیا اور زمین کی آلودگیوں سے ایمان کی قوت کے ذریعے پاک وصاف ہو کر بلند ہوں گے۔

اور ایسے لوگوں کی جزاء کیا ہے۔

(آیت) "وسوف یوت اللہ المومنین اجرا عظیما" (۴ : ۱۴۶) (اللہ عنقریب اہل ایمان کو اجر عظیم عطا کرے گا) ان جھلکیوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ اسلامی معاشرے میں منافقین کی حقیقت کو واضح فرماتے ہیں۔ ان کی شان گرتی ہے۔ اہل ایمان کو نفاق کی لغزشوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ انجام بد سے ڈرایا جاتا ہے۔ منافقین کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا جاتا ہے تاکہ ان میں سے جس کے اندر شمہ برابر خیر بھی ہو وہ اسلامی صفوں میں شامل ہو جائے' نہایت سچائی اور نہایت اخلاص کے ساتھ۔

اور سب سے آخر میں ایک عجیب جھلکی دکھائی جاتی ہے جس کا اثر نہایت ہی گہرا ہے۔ خوفناک عذاب کے ذکر کے بعد اور عظیم اجر کے اعلان کے بعد تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ بندوں کے عذاب سے غنی ہے۔ اللہ کو ان کے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ انھیں عذاب دے۔ اور نہ اس تعذیب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنی قوت کا اظہار چاہتا ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے اندر ایسی کوئی خواہش ہے کہ وہ لوگوں کو تکلیف دے جیسا کہ بت پرستانہ تصورات میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ ایمان اور شکر خداوندی کے ذریعے لوگوں کی اصلاح ہو۔ ایمان اور شکر ان کو محبوب ہو اور اللہ وہ ذات ہے جو نیک اعمال کا بدلہ دیتا ہے اور تمام خفیہ باتوں سے واقف ہے۔

(آیت) "مایفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم وامنتم وکان اللہ شاکرا علیما (۴ : ۱۴۷) (آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے۔ اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے)

اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو تو اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ تمہیں عذاب دے۔ اللہ تو کفر اور نافرمانی پر سزا دیتا ہے۔ یہ ایسی تہدید ہے جو لوگوں کو ایمان اور شکر پر آمادہ کر سکتی ہے۔ اللہ کو نہ انتقام کا کوئی داعیہ ہے اور نہ تعذیب میں کوئی مزہ آتا ہے۔ نہ اللہ اس طریق کار کے مطابق اپنی قوت اور سلطنت کا اظہار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں سے بہت ہی بلند ہے' اگر تم ایمان لاؤ اور شکر کرو تو یہ اللہ کے ہاں موجب مغفرت اور رضامندی ہے۔ اللہ کی جانب سے بندوں کا شکریہ۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو دل پر گہرا اثر کرتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اللہ کی جانب سے شکر کے معنی یہ ہیں کہ اللہ راضی ہے۔ اور رضامندی کا لازمی نتیجہ ثواب دارین ہے۔ لیکن یہ تعبیر کہ اللہ شکر کرتا ہے نہایت ہی گہری اور اشاراتی تعبیر ہے۔

اگر وہ ذات جو خالق ہے' برتر ہے' دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے' بندوں کا شکر ادا کرتا ہے اس بات پر کہ یہ بندے نیک ہو گئے ہیں' اچھے مومن ہیں شکر بجالانے والے ہیں اور اللہ کے احسانات کو ماننے والے ہیں۔ حالانکہ وہ غنی بادشاہ ہے اور اس کو بندوں کے شکر' احسان مندی اور صلاح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اس جہان کا پیدا کرنے والا' وجود میں لانے والا' برتر اور غنی بادشاہ اگر شکر بجالاتا ہے تو پھر بندوں کا کیا فرض بنتا ہے جو مخلوق بھی ہیں اور ان پر رات دن انعامات کی بارش ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے بندوں کو اپنے خالق کا وفادار ہونا چاہیے۔۔ بیشک یہ ایک نہایت ہی شرمسار کنندہ جھلکی ہے اور بندہ مومن ایک گہرا تاثر لے کر شکر نعمت کے لیے اٹھتا ہے۔ یہ ایک روشن اشارہ ہے جو نشانات منزل متعین کرتا ہے ۔ وہ منزل جو اللہ تک جاتی ہے' جو بخشندہ' منعم' شاکر اور علیم ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کے تیس پاروں میں سے ایک پارہ۔ اور یہ اپنے دونوں بازوؤں کے نیچے اصلاح نظر ثانی' درستی اور پاکیزگی پر مشتمل ہدایات کا ایک عظیم ذخیرہ لیے ہوئے ہے۔ اس میں عالم نفس کی اصلاح' اسلامی معاشرے کی اصلاح' نظام حیات کی اصلاح اور دوسری تعمیری ہدایات ہیں جو اس کے طول و عرف میں پیوستہ ہیں۔ ان ہدایات کے اندر انسان کو بالکل ایک نیا جنم دیا گیا ہے اور ایک ایسا انسان وجود میں لایا گیا ہے کہ جس کی مثال انسانیت نے نہ پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ بعد میں دیکھی۔ حقیقت پسند مثالی انسان نظافت اور تطہیر میں مثالی۔ ایک ایسا انسان جو زندگی کے مختلف میدانوں میں کام کرتا ہے اور یہ ایک ایسا انسان ہے جسے اسلامی زندگی نے جاہلیت کے گہرے گڑھوں سے نکال کر نہایت ہی عمودی بلندی پر سر بلند کیا اور اعلیٰ ترین بلندیوں پر پہنچا دیا۔ نہایت ہی آسانی کے ساتھ' نہایت ہی نرمی کے ساتھ اور نہایت ہی ہمدردی کے ساتھ۔ (اسلام آباد' ۱۷ دسمبر ۱۹۸۹ء رات ۵۵ : ۱۰)

148: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ○

اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے' الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔)

: پارہ نمبر ۶ ایک نظر میں

پارہ ششم دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ سورۃ النساء کے بقیہ حصہ پر مشتمل ہے۔ سورۃ النساء کا آغاز پارہ چہارم کے آخر سے ہوا تھا پورا پارہ پنجم بھی اس پر مشتمل ہے اور پارہ ششم میں بھی اس کا کچھ آ گیا ہے۔ اس پارے کا دوسرا حصہ' جو اس کا تقریباً تین چوتھائی حصہ ہے سورۃ مائدہ پر مشتمل ہے۔

یہاں ہم اپنی بات کو صرف اس پارے کے حصہ اول ہی تک محدود رکھیں گے۔ حصہ دوئم یعنی سورۃ مائدہ پر بحث سورۃ مائدہ کے موقع پر ہو گی۔ جہاں ہم سورۃ مائدہ کی اہمیت اور اس کے موضوعات پر اسی طرح بحث کریں گے جس طرح ہم اس سے پہلے کی سورتوں پر کر چکے ہیں۔ اگر اللہ کا تعاون شامل حال رہا۔

سورۃ نساء پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے اس سورۃ کے جس منہاج بحث کے سلسلے میں کچھ کہا تھا اس حصے میں بھی وہی منہاج چل رہا ہے۔ یہاں مناسب ہے کہ نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے دو بار قارئین کے پیش نظر رکھ دیا جائے۔

یہ سورۃ اسلامی تصور حیات سے بحث کرتی ہے اور اسے اس نوخیز اسلامی جماعت کے ذہن نشین کرنے کے درپے ہے جسے اس نے جاہلیت کی گہری اور تنگ وادیوں سے اٹھایا اور اسے بتدریج بام عروج تک پہنچا دیا۔ انتہائی بلندیوں تک اور اس جماعت کے ضمیر کو جاہلیت کے افکار کے ڈھیروں کے نیچے سے نکالا اور اس کے ان افکار کو چھانٹ کر رکھ دیا جن کی وجہ سے اس کے ضمیر کے خدوخال دھندلے پڑ گئے تھے۔ اس صفائی کے ساتھ ساتھ جس طرح ہم نے اوپر کہا اسلامی فکر و شعور سے جاہلیت کے خدوخال مٹا کر ان کی جگہ اسلامی رنگ بھرے گئے۔

اس کے بعد اس جدید تصور حیات کی روشنی میں' یہ سورۃ امت مسلمہ کے ضمیر اس کے اخلاق اور اس کی اجتماعی عادات کو لیتی ہے اور ان کو جاہلی اخلاق و عادات سے ایک ایک کر کے چھانٹتی چلی جاتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح افکار و تصورات کے اعتبار سے اس کی تطہیر کی گئی۔ نیز فکری اور اخلاقی تطہیر کے علاوہ اس سورۃ نے امت کی اجتماعی زندگی اور اس کے عائلی روابط کو اسلام کے مضبوط ربانی نظام زندگی کی اساس پر استوار کیا۔

اس تربیت اور تطہیر کے دوران' اس سورۃ میں منحرف اور غلط عقائد کو بھی لیا گیا ہے۔ غلط عقائد و تصورات کے حاملین پر بھی تنقید کی گئی ہے اور اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔ چاہے یہ لوگ مشرکین میں سے ہوں یا یہود و نصاریٰ یعنی اہل کتاب ہوں۔ ان کے عقائد کی تصحیح اور اصلاح کی گئی ہے ۔ حق اور سچائی کو نکھارا گیا ہے جسے ان انحرافات نے بگاڑ دیا تھا۔ جو ان لوگوں نے اپنی کتب میں اور عقائد میں داخل کئے ہوئے تھے۔

اس کے بعد مضامین سورۃ اس معرکے میں داخل ہو جاتے ہیں جو اہل کتاب اور جماعت مسلمہ کے درمیان مسلسل برپا تھا' خصوصاً یہودیوں کے ساتھ۔ اس لیے کہ جب سے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی جماعت کو لیکر مدینہ پہنچے تھے' ان لوگوں نے دعوت اسلامی کا بڑی شدت کے ساتھ مقابلہ شروع کر دیا تھا' اس لیے کہ تحریک اسلامی کا مرکز مدینہ منتقل ہوتے ہیں یہودیوں کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اب مدینہ کے معاشرے میں ان کی سابقہ ممتاز حیثیت قائم نہیں رہ سکتی ان کے ملی وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا حتیٰ کہ ان کا یہ ادعا بھی ختم ہو رہا تھا کہ وہ واحد ممتاز لوگ ہیں جنہیں اللہ کی قربت حاصل ہے اور وہ ایسی قوم ہیں جو اللہ کے ہاں برگزیدہ ہے۔ ان وجوہات کی بناء پر وہ تحریک اسلامی کے مقابلے میں ہر قسم کے ہتھیار لیکر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس سورۃ نے ان کی ذہنیت' ان کے وسائل حرب اور خود ان کے اپنے انبیاء کے ساتھ ان کا تاریخی رویہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا تاکہ معلوم ہو کہ انھوں نے ہمیشہ ہر دعوت حق کے ساتھ یہی برتاؤ کیا چاہے اس کا پیش کرنے والا کوئی بھی ہوا گرچہ وہ پیش کرنے والا خود ان کا اپنا نبی' ان کا اپنا قائد اور ان کا اپنا نجات دہندہ ہو۔

اس کے بعد یہ سورۃ خود امت مسلمہ کو بتاتی ہے کہ اس کے کاندھوں پر جو بوجھ ڈال دیا گیا ہے' اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس نے اس کرہ ارض پر جو کردار ادا کرنا ہے وہ کس قدر عظیم کردار ہے اور وہ حکمت عملی کیا ہے جس کے مطابق اسے جاہلیت کی تمام الائشوں سے پاک کرنا مقصود ہے' اس

کے ضمیر کو پاک کرنا مطلوب ہے اس کی پوری زندگی کو پاک کرنا مطلوب ہے۔ اس غرض کیلئے کس قدر بیدار مغزی کی ضرورت ہے اور کس قدر عظیم قربانیوں کی ضرورت ہے۔ مثلاً اپنے نفس کی دنیا کے ساتھ مسلسل جہاد' اور اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے پورے ماحول کے ساتھ مسلسل جہاد اور مسلسل قربانیاں۔

یہ پوری سورۃ مسلسل اپنی اس راہ پر گامزن ہے گزشتہ حصے میں بھی یہی مضامین ہیں اور یہ حصہ بھی اسی راستے کے نشیب و فراز پر مشتمل ہے اور وہی اسلوب ہے جو سابقہ پارے میں تھا۔

اس پارے کا آغاز ہی تطہیر نفس اور تطہیر معاشرہ سے ہوتا ہے' یہ کوشش کی گئی ہے کہ افراد جماعت کے درمیان باہم مکمل اعتماد کی فضا قائم رہے ۔لوگ یہودیوں کے الزامات سے متاثر نہ ہوں اور مسلمان یہ حق رکھتے ہیں کہ وہ بدلہ لیں لیکن عفو و درگزر اور فراخدلی بہر حال انصاف کے ترازو سے بھی زیادہ اونچا مقام ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ غیبت اور بدگوئی کو ناپسند فرماتے ہیں۔ اگر اس نئے معاشرے میں ایک بھائی دوسرے بھائی پر ظلم کرتا ہے اور مظلوم بھائی معاف کر دیتا ہے تو یہ فعل اللہ تعالیٰ کو بہت ہی پسندیدہ ہے۔ اللہ خود بھی معاف کر دیتا ہے حالانکہ وہ انتقام پر قادر ہوتا ہے۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اسلامی تصور حیات یہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کو ایک نظام زندگی قرار دیتا ہے اور یہ تصور دیتا ہے کہ انسانی تاریخ میں رسولوں کا قافلہ صرف اس ایک دین کا حامل رہا ہے۔ اسلامی عقائد کے مطابق ان رسولوں کے درمیان فرق کرنا اور وہ جو ادیان لیکر آئے ان کے درمیان فرق کرنا صریح کفر ہے۔ یہ بیان اس لیے آتا ہے کہ اہل کتاب میں سے یہودیوں کے اس نظریے کی تردید کی جائے کہ ان کے نبی کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے اور یہ نظریہ انھوں نے محض دینی اور قومی تعصب اور کینہ پروری کی وجہ سے اپنایا ہے۔

اس حصے میں یہودیوں کے ساتھ ایک راؤنڈ شروع ہو جاتا ہے' جس میں بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے نبی اور اپنے قائد اور نجات دہندہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ کیا کیا نافرمانیاں اور بدسلوکیاں کیں۔ ان واقعات سے یہ عیاں کرنا مطلوب ہے کہ یہودی اپنی فطرت کے اعتبار سے برے لوگ ہیں۔ سچائی اور اسلامی دعوت کے ساتھ ان کا ہمیشہ یہی رویہ رہا ہے۔ چاہے کوئی نبی ہی یہ دعوت دے رہا ہو۔ اگرچہ وہ ان کے عظیم نبی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ہی کیوں نہ ہوں۔ نیز حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ان کی والدہ کے بارے میں ان کے نازیبا الفاظ کی تردید بھی کی گئی ہے جسے اللہ تعالیٰ بہت ہی ناپسند فرماتے ہیں۔ ان واقعات کے بیان سے نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ان کا رویہ اور عناد قابل فہم ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس رویئے کے حقیقی اسباب کیا ہیں۔ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے بارے میں یہودیوں کے غلط دعوؤں اور غلط الزامات کی مناسبت سے اور خصوصاً اس دعوے کے حوالے سے کہ انھوں نے حضرت مسیح (علیہ السلام) کو قتل کر دیا ہے' قرآن کریم اظہار حقیقت کر دیتا ہے۔ ان کے دعوائے قتل مسیح (علیہ السلام) کی صاف صاف تردید کر دی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو ان کے مظالم کرنے ارادہ حق میں رکاوٹ بن جانے اور ان کی سود خوری کی وجہ سے (حالانکہ انھیں ان حرکات سے روکا گیا تھا) کیا کیا

سزائیں دیں۔ نیز ان کی حرام خوری اور لوگوں کے معاشی استحصال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر بطور سزا ان بعض چیزوں کو حرام قرار دے دیا جو ساری دنیا کے لیے حلال تھیں اور یہ کہ اس دنیاوی عذاب کے علاوہ انھیں وہ عذاب الیم بھی دیا جائے گا جو آخرت میں ان کا انتظار کر رہا ہے۔ ہاں البتہ اس عذاب سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو علم میں پختہ کار ہیں اور جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے ہیں۔ جنہوں نے سچائی کو پہچان لیا ہے اور اس کی پیروی کرنے لگے ہیں۔

یہودی' نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کے انکار پر جو اصرار کر رہے تھے' ان کے اس موقف کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ رسالت تو معمول کی بات ہے۔ یہ کوئی عجیب و غریب امر تو نہیں ہے کہ خود ان میں سے ایک رسول مبعوث ہو گیا ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے کہ لوگوں کی ہدایت کیلئے ایک انسان رسول بن کر آ گیا ہے۔ یہ تو سنت الٰہی ہے۔ حضرت نوح (علیہ السلام) سے لیکر آج تک رسول آتے رہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام)' حضرت اسماعیل (علیہ السلام)' حضرت اسحاق (علیہ السلام)' حضرت یعقوب (علیہ السلام)' حضرت عیسیٰ (علیہ السلام)' حضرت ایوب (علیہ السلام)' حضرت ہارون (علیہ السلام) حضرت سلیمان (علیہ السلام)' اور حضرت داؤد (علیہ السلام) اسی سنت الٰہی کے مطابق بھیجے گئے۔ نیز وہ تمام دوسرے انبیاء جن کی رسالت کے یہود قائل ہیں اور وہ جن کی رسالت کا وہ محض بغض اور حسد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت اور اسکیم ہے کہ یہاں لوگوں کی ہدایت کیلئے رسول آئیں جو ڈرانے والے اور خوشخبری دینے والے ہوں۔ (آیت) "لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل (۴ : ۱۶۵)" تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے خلاف کوئی حجت نہ ہو۔" نہ صرف یہ کہ یہ منطقی امر ہے بلکہ ضروری بھی ہے۔

یہودیوں کے انکار حق کے مقابلے میں' اللہ تعالیٰ اسلام کی سچائی پر خود شہادت دیتے ہیں' ملائکہ کی شہادت قلم بند ہوتی ہے اور اللہ کسی بھی امر پر کافی گواہ ہے۔ چنانچہ انکار حق کی وجہ سے اور راہ حق کو مسدود کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان ظالموں اور کافروں کو سخت دھمکی دیتے ہیں۔ یہ کہ اللہ کبھی ان کی مغفرت نہ کرے گا کبھی ان کی راہنمائی صراط مستقیم کی طرف نہ کرے گا اور اگر ان کی راہنمائی کرے گا تو وہ جہنم کی طرف ہو گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اس کے بعد تمام لوگوں کو پکارا جاتا ہے کہ لوگو! یہ رسول تمہارے پاس رب کی طرف سے سچائی لیکر آیا ہے۔ تم اس پر ایمان لاؤ' اگر تم ایسا نہ کر سکو تو جو کچھ زمین اور آسمانوں کے درمیان ہے وہ سب کچھ اللہ کا ہے۔ مالک ارض و سما نے اس پیغمبر کی رسالت کی شہادت دے دی ہے۔ اور وہ خود تمہیں دعوت ایمان دے رہا ہے اس لیے وہ خود اپنے لیے جو راہ متعین کر رہے ہیں وہ مالک ارض و سما کے مقابلے کی راہ ہے۔

اہل کتاب کے ساتھ یہ راؤنڈ ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں ان کا مزاج' ان کے وسائل کار' اور قدیم زمانے سے ان کی بری عادتوں کا پردہ چاک کر دیا جاتا ہے۔ اس پردہ دری سے ان کے تمام مکاریاں فیل ہو جاتی ہیں اور یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت برحق ہے اس لیے کہ اس پر اللہ کی جانب سے شہادت دی جا چکی ہے۔ تمام سلسلہ رسل اور سلسلہ اصحاب دعوت بھی اس پر گواہ ہیں۔ یوں لوگوں پر اللہ کی جانب سے حجت قائم ہوتی ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ لوگوں کی نجات کا دارومدار رسولوں کی رسالت پر پختہ ایمان پر ہے۔ اگر وہ عذاب

جہنم سے نجات چاہتے ہیں یا یہ کہ وہ بتقاضائے منطق اپنے آپ کو اس کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ یہ ان کی مرضی ہے لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ یہ نہایت ہی خطرناک انجام ہے۔

یہودیوں کے ساتھ اس راؤنڈ کے اختتام' ان کے مقابلے میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی والدہ ماجدہ کو انصاف دینے اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت مریم (علیہ السلام) کے بارے میں ان کے غلط دعوؤں کی تردید کرنے کے بعد اب خود عیسائیوں کے ساتھ ایک راؤنڈ شروع ہوتا ہے' جو اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا پیروکار کہتے ہیں۔ ان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ تم لوگ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں غلو نہ کرو۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں اصل سچائی یوں ریکارڈ کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور وہ خود بھی اس بات کے اقرار سے نہیں ہچکچاتے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں۔ اس طرح ملائکہ بھی اللہ کے بندے ہیں لہٰذا تم روح القدس کو خدا نہ سمجھو' تثلیث کا عقیدہ غلط ہے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور اللہ کے درمیان باپ بیٹے کا تعلق نہایت ہی غلط تصور ہے۔

تصحیح عقائد نصرانیت کے درمیان اسلام کا صحیح عقیدہ بھی بتادیا جاتا ہے اور اس بات کو چھانٹ کر رکھ دیا جاتا ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے اور غلامی بندوں کے لیے اور اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے جو کوئی بھی ہے وہ اللہ کا بندہ اور غلام ہے اور یہ اسلامی تصور حیات کا اساسی عقیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان کو یہاں فلاں کی خوشخبری دی جاتی ہے اور اہل کفر کو سخت الفاظ میں ڈرایا جاتا ہے اور یہاں بھی' یودیوں کی بحث کے خاتمے کی طرح تمام لوگوں کے نام اعلان جہاد کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ لوگوں کے پاس اللہ کی جانب سے برہان آچکا ہے' اس لیے اب جو لوگ اس کی قبولیت سے رہ گئے ان کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی' کوئی شبہات وہ پیش نہ کرسکیں گے اور نہ ان کی کوئی معذرت قبول ہوگی۔

سورۃ کا خاتمہ احکام میراث میں سے کلالہ کی ایک صورت کے بیان پر ہے جو پہلے احکام میں بیان نہ ہوئی تھی اس سورۃ میں کلالہ کی بعض صورتوں کا ذکر ہوچکا ہے یہ انہی کا بقیہ ہے۔ اس لیے اس کو یہاں دے دیا کیونکہ یہ جماعت مسلمہ کی اقتصادی تنظیم نو کا بقیہ حصہ تھا جس پر اسلام اس جدید اسلامی سوسائٹی کو استوار کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایک ایسی سوسائٹی میں تبدیل کرنا چاہتا تھا جس کا اپنا نظام اقتصادیات ہو' اپنے امتیازی خصائص ہوں جو مستقل ہوں تاکہ یہ جدید سوسائٹی اور یہ نئی جماعت پوری انسانیت کے حوالے سے اپنا وہ عظیم کردار ادا کرسکے جس کے لیے اللہ نے اسے برپا کیا ہے ۔ یعنی قیادت' انقلاب اور تنظیم واصلاح کا کردار۔

یوں اس پوری سورۃ کے مطالعے اور جائزے سے اور خصوصاً زیر بحث حصے کے جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں اجتماعی تنظیم' اقتصادی اصلاحات اور سیاسی ضابطہ بندی کے ساتھ ساتھ اخلاق' تہذیب' تصور حیات کی اصلاح اور عقائد کی تصحیح بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس اخلاقی اور نظریاتی تربیت کے ساتھ ساتھ جماعت مسلمہ کے دشمنوں کے ساتھ میدان جنگ میں بھی معرکہ آرائی جاری رہتی ہے اس کے باوجود کہ اس جماعت کے کاندھوں پر ذمہ داری کا عظیم بوجھ ڈالا گیا ہے اور اس کرہ ارض پر اس کیلئے عظیم کردار ادا کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ یہ بھی فیصلہ کردیا گیا ہے کہ قرآن کریم اس جماعت کا دستور العمل ہے۔ یہ اس کی دعوت کا ماخذ ہے۔ اس جماعت کا فرض ہے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو ایک ساتھ ادا

کرتے ہوئے آگے چلے' نہایت گہری' متوازن اور عمومی صورت میں۔ یہ ہدایات اور یہ امور ایسی صورت میں بیان کئے جاتے ہیں کہ جو شخص یا جماعت بھی اس امت کی تعمیر جدید کا بیڑا اٹھائے اس کیلئے یہ منہاج لازمی اور حتمی ہو تاکہ وہ اپنے فرائض کو پورا کرے۔ اس قرآن کو اپنی دعوت کا منہاج بنائے۔ اس کی تحریک کا منہاج اس قرآن سے اخذ ہو۔ احیائے اسلام' بعث جدید اور تعمیر جدید کا ہر قدم اس منہاج کے مطابق ہو۔ اگر ان خطوط پر سوچا جائے تو یہ قرآن بعینہٖ وہ کردار ادا کرنے کیلئے اب بھی تیار کھڑا ہے جو اس نے پہلے ادا کیا تھا۔ یہ قرآن پوری انسانیت کیلئے اللہ کا خطاب ہے' اور وہ اس کے تمام طور واطوار کے لیے قیامت تک راہنما ہے۔ اس کے عجائبات تو کبھی ختم نہ ہوں گے اور اس کے بار بار پڑھے جانے سے وہ پرانا نہیں ہوتا' جیسا کہ اس کے بارے میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں۔ وہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جنہوں نے اس قرآن کے ذریعہ کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کیا۔ اس کے ساتھ منحرف اور بھٹکے ہوئے اہل کتاب کے ساتھ جہاد کیا اور اس کے ذریعے انسانیت کی تاریخ میں امت مسلمہ جیسی عظیم امت کی بنیاد رکھی' اسے اٹھایا اور سربلند لیا۔

: درس نمبر ۴۳ تشریح آیات

۱۴۸۔۔ تا۔۔ ۱۷۰۔

قرآن کریم کے پیش نظر یہ نصب العین تھا کہ وہ اس کرہ ارض پر ایک بالکل جدید امت پیدا کرے۔ چنانچہ اس امت کو قرآن نے ان لوگوں سے تشکیل دیا جو جاہلیت کی اندھیری وادیوں میں بھٹک رہے تھے ان میں سے جو قرآن کی دعوت پر لبیک کہہ چکے' ان مومنین کو قرآن کریم نے ہاتھ سے پکڑ کر آناً فاناً عمودی بلندی پر چڑھا کر تہذیب وتمدن کی چوٹیوں' بلند ترین چوٹیوں تک پہنچا دیا۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ اس کی تشکیل اور تربیت کے بعد اسے پوری انسانیت کی قیادت کا فریضہ سپرد کیا جاسکے اور اس دنیا کی قیادت میں اس کا عظیم رول متعین کیا جاسکے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہوا۔

اس جماعت کی تشکیل اور تعمیر کے اہم مقاصد میں سے ایک اہم مقصد اس جماعت کے ضمیر کی تطہیر بھی تھا' اس ماحول کی تطہیر بھی تھا جو اس جماعت کے ارد گرد پایا جاتا تھا اور اس جماعت کی اس اخلاقی اور ذہنی سطح کو بلند کرنا بھی تھا جس پر اس وقت پر جماعت تھی۔

اور جب یہ جماعت اس مطلوبہ سطح اور معیار تک پہنچ گئی اپنے انفرادی اخلاق میں اونچی ہو گئی' اپنے اجتماعی اخلاق میں معیاری ہو گئی جس قدر اپنے عقائد وتصورات میں وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں برتر ہو گئی۔ تو اس وقت پھر اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس کرہ ارض پر وہ انقلاب برپا کیا جو اللہ کے پیش نظر تھا۔ اس کے بعد اللہ نے اس امت کو اپنے دین اور اپنے نظام زندگی کا محافظ اور چوکیدار مقرر فرمایا۔ اس کی یہ ڈیوٹی قرار پائی کہ وہ اس پوری انسانیت کو گمراہی اور اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے اور مسلسل اس پوری انسانیت کی قیادت کی امانت دار رہے اور اس کی راہنمائی کرتی رہے اور فی الواقع ایسا ہی ہوا۔

جب کوئی جماعت اس کرہ ارض کے پورے انسانوں پر ان خصوصیات کے اندر فوقیت حاصل کر لیتی ہے تو انسانیت کے لیے اس کی قیادت بالکل ایک فطری اور طبیعی امر بن جاتا ہے اور یہ امر اپنی صحیح اساسوں پر قائم ہوتا ہے۔ اس صورت حال کے نتیجے میں ایسی جماعت پھر علم و ثقافت اور تہذیب و تمدن اور اقتصادیات اور سیاسیات میں بھی دوسری اقوام سے برتر ہو جاتی ہے اور یہ دوسری برتری اسے پہلی برتری کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے یعنی اخلاقی اور نظریاتی برتری کے نتیجے میں اور یہی ہے سنت الٰہی اس کرہ ارض کے تمام افراد کیلئے بھی اور تمام جماعتوں اور سوسائٹیوں کیلئے بھی۔ اسی نفسیاتی اور اجتماعی تطہیر کے ایک پہلو کو درج ذیل دو آیات کے اندر لیا گیا ہے۔

(آیت) " نمبر ۱۴۸ تا ۱۴۹۔

معاشرہ ہمیشہ نہایت ہی حساس ہوتا ہے اس لیے اسے بعض ایسے اجتماعی آداب کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی اس حساسیت کے مناسب حال ہوں۔ بعض اوقات ایک شخص ایک سرسری سی بات کہتا ہے لیکن معاشرے پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں' ان کا وہ اندازہ نہیں کر سکتا۔ اور بعض اوقات ایک عام بات ہوتی ہے لیکن اس کے قائل کی مراد صرف ایک شخص سے ہوتی ہے لیکن ان باتوں کے اثرات معاشرے کی نفسیات' اس کے اخلاق اور اس کے رسوم و رواجات پر نہایت ہی مہلک ہوتے ہیں۔ اس بات سے صرف وہ ایک فرد ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس سے پوری جماعت متاثر ہوتی ہے۔

کوئی شخص کسی کے بارے میں بدگوئی کرنا چاہے اس کی جو شکل و صورت بھی ہو' اگر اس کے دل میں خدا ترسی نہ ہو اور اس کا ضمیر محتاط نہ ہو تو یہ بدگوئی انسان کیلئے بہت ہی آسان ہوتی ہے۔ لیکن اس بدگوئی اور بدزبانی کے آثار معاشرے میں بہت ہی برے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ بعض اوقات اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ معاشرے سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ لوگوں کا یہ خیال ہو جاتا ہے کہ اب معاشرے میں شر کو غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے اندر شر کی استعداد پوشیدہ ہوتی لیکن وہ معاشرتی دباؤ کی وجہ سے شر کا ارتکاب نہیں کرتے وہ اس کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں اب اس کا ارتکاب عام طور پر کیا جاتا ہے اس لیے وہ اس سے باک نہیں کرتے اور نہ ہی انھیں کوئی معاشرتی خوف لاحق ہوتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ صرف وہی اس کا ارتکاب نہیں کر رہے اور لوگ بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ کسی برائی کا ارتکاب دیکھتے دیکھتے انسان کے دل سے اس برائی کی کراہت میں کمی آجاتی ہے۔ انسان پہلے پہل برائی کو بہت ہی شدت سے محسوس کرتا ہے اور جب اس کا بار بار ارتکاب ہوتا رہے یا بار بار ذکر ہوتا رہے تو اس کی نظروں میں اس کی قباحت کم ہو جاتی ہے اور اس کی جانب سے اس کراہت میں کمی آجاتی ہے لوگوں کیلئے ایسی برائی کا سننا آسان ہو جاتا ہے اور پھر وہ اسے مٹانے کیلئے فوراً اٹھتے بھی نہیں ہیں۔

بدگوئی میں انسان سب سے پہلے انفرادی الزامات عائد کرتا ہے۔ انفرادی گالی گلوچ ہوتی ہے۔ اس کے بعد اجتماعی نقصان اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اخلاقی بے راہ روی پھیل جاتی ہے۔ اس میں بعض لوگوں کے بعض دوسرے کے بارے میں اندازے بدل جاتے ہیں' بعض لوگوں کا بعض دوسرے

لوگوں میں اعتماد نہیں رہتا' بعض جماعتوں کا دوسری جماعتوں پر اعتماد نہیں رہتا۔ الزامات پر الزامات آتے ہیں اور زبانیں انھیں بلا کسی جھجک کے چاٹتی رہتی ہیں۔

یہ وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جماعت مسلمہ کیلئے ایک دوسرے کی بدگوئی کو حرام قرار دیا ہے۔ صرف وہی شخص بدگوئی کر سکتا ہے' جس پر ظلم ہوا ہو۔ وہ صرف اس قدر برے لفظ استعمال کر سکتا ہے جن سے ظالم کے حقیقی ظلم کا اظہار ہو رہا ہو ان حدود کے اندر جن کے اندر ظلم ہوا ہے۔

(آیت) "لایحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلم"۔ (۴ : ۱۴۸) "(اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے' الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو)

ظلم کے حالات میں بدگوئی کے ذریعے دشمن سے بدلہ لیا جاتا ہے اور اسی طرح ظلم کے مقابلے میں مدافعت کی جاتی ہے۔ اس بدگوئی میں وہ امور بھی شامل ہیں' جنہیں قانونی اصطلاح میں سب وشتم کہا جاتا ہے۔ اس بدگوئی کے ذریعے ایک فرد' اس انفرادی بدسلوکی کو مسترد کرتا ہے جو فی الواقعہ ہو چکی ہے۔ اس طرح یہ مظلوم اس ظلم اور ظالم کے خلاف پراپیگنڈا کرتا ہے۔ جس کا اسے حق حاصل ہوتا ہے تاکہ سوسائٹی اس مظلوم شخص کے ساتھ انصاف کر سکے۔ وہ ظالم کے ہاتھ کو روک سکے اور معاشرے کے اندر ایک ایسی فضاء قائم ہو سکے جس میں ہر ظالم ظلم سے پہلے اپنے انجام کے بارے میں اچھی طرح سوچے اور اس ظلم کے دوبارہ ارتکاب سے باز آجائے۔ اعلانیہ بدگوئی کا حق بالکل محدود ہے اسے صرف وہی شخص استعمال کر سکتا ہے جس پر ظلم ہوا ہو۔ اس کے جواز کا سبب بھی محدود ہے۔ یعنی صرف وہ ظلم جو کسی متعین شخص کے ساتھ کیا گیا ہو اور یہ بدگوئی صرف اس شخص کے خلاف کی جاسکتی ہے جس نے ظلم کیا ہو۔ ان محدود حالات میں اس بدگوئی کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ اس سے ایک بڑی بھلائی کو رواج دینا مقصود ہے۔ نیز اس بدگوئی سے ظلم اور ظالم کے خلاف صرف تشہیر ہی مقصود نہیں ہے بلکہ اصل یہ کہ مظلوم کو عدل وانصاف مل سکے

۔

اسلامی قانون لوگوں کی شہرت اور عزت کی حفاظت صرف اسی حد تک کرتا ہے' جب تک وہ ظلم وزیادتی نہ کریں۔ جب وہ ظلم کا ارتکاب کریں تو پھر وہ اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ ان کی حیثیت عرفی کو قانونی تحفظ دیا جائے۔ ظلم کے ارتکاب کے بعد مظلوم کو یہ قانونی حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائے اور ایک حد تک بدگوئی بھی کرے۔ یہ واحد استثناء ہے جو مظلوم کے سلسلے میں ہے' ورنہ اسلام کا عام قانونی اور اخلاقی ضابطہ یہی ہے کہ کسی کے خلاف بدگوئی کی اجازت نہ ہو گی۔

اس طرح اسلام کے ان دونوں مقاصد کے درمیان ایک قسم کا توازن قائم ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا نظام انصاف قائم کرنا چاہتا ہے جس میں ظلم کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ ایک ایسا نظام اخلاق بھی رائج کرنا چاہتا ہے جس میں حیائے چشمی اور اجتماعی رواداری پر بھی خراش نہ آئے۔

اس پر قرآن کریم یہ اختتامیہ لاتا ہے۔ (آیت) "وکان اللہ سمیعا علما"۔ (۴ : ۱۴۸) (اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے) اور انتہائے کلام پر بھی بات اللہ جل شانہ کی ذات سے مربوط ہو جاتی ہے۔ جبکہ آغاز ذکر محبت الٰہی سے ہوا تھا۔

(آیت) "لایحب اللہ الجھر بالسوء"۔ (۴ : ۱۴۸) "(اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے) یہ اس لیے کہا گیا تاکہ انسان کے دل میں یہ شعور زندہ رہے کہ انسان کی نیت' انسان کی جانب سے بدگوئی کے اسباب اور پھر اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اور الزامات کی صحت اور ان کی موزونیت کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کیونکہ اللہ سنتا ہے اور جو بات کہی جاتی ہے اس کے تمام پس منظر سے وہ اچھی طرح آگاہ ہے جو بات بھی سینوں میں بھی عیاں ہے۔

قرآن کریم یہاں بات کو بدگوئی کی صرف ممانعت یعنی صرف منفی حکم پر ہی ختم نہیں کر دیتا بلکہ وہ مثبت بات کر کے بھلائی کا حکم دیتا ہے۔ اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ برائی پر عفو و درگزر سے کام لینا بہر حال بہت ہی پسندیدہ ہے۔ عفو و درگزر کو صفات الٰہیہ میں سے ایک اہم صفت ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر خطاکار سے مواخذہ کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ یہاں اشارہ دیا جاتا ہے کہ اہل ایمان کو اللہ کے اخلاق و صفات اپنے اندر پیدا کرنا چاہئیں۔ جہاں تک ان میں قدرت ہو اور جہاں تک وہ ایسا کر سکیں۔

149: اِنۡ تُبۡدُوۡا خَیۡرًا اَوۡ تُخۡفُوۡہُ اَوۡ تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیۡرًا ○

مظلوم ہونے کی صورت میں اگرچہ تم کو بدگوئی کا حق ہے) لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کئے جاؤ' یا کم از کم برائی سے درگزر کو' تو اللہ (کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے حالانکہ سزا دینے پر) پوری قدرت رکھتا ہے۔

(آیت) "ان تبدوا خیرا او تخفوہ او تعفوا عن سوء فان اللہ کان عفوا قدیرا (۴ : ۱۴۹) (لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کئے جاؤ' یا کم از کم برائی سے درگزر کو' تو اللہ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے حالانکہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔")

یوں اسلام کا منہاج تربیت نفس مومن اور جماعت مسلمہ کو ایک قدم اور بلند کر دیتا ہے پہلا مرحلے میں کہا جاتا ہے کہ کسی شریف انسان کیلئے بدگوئی کے ساتھ منہ کھولنا اچھا نہیں ہے۔ اس مرحلے میں ایک استثنائی صورت یہ رکھی جاتی ہے کہ مظلوم بدگوئی کر کے بدلہ بھی لے سکتا ہے اور حصول انصاف کو بھی ممکن بنا سکتا ہے۔ دوسرے مرحلے پر اہل ایمان کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بھلائی کیلئے ہر وقت کوشاں رہیں اور جس شخص پر ظلم کیا گیا ہے اور وہ بدگوئی کر کے اپنا بدلہ لے سکتا ہے اسے بھی یہ کہا گیا ہے کہ اگر وہ معاف کر دے اور صرف نظر کرے تو یہ نہایت ہی اچھا فعل ہے۔ یہ نہایت ہی بلند اخلاقی ہے' بشرطیکہ وہ انتقام پر قادر ہو اور وہ انتقام کے بجائے عفو و درگزر کو ترجیح دے۔ کیونکہ قدرت انتقام کے بغیر عفو کیا معنی؟ گدا گر تواضع کند خوائے اوست۔

اگر عفو و درگزر کی نیکی کھل کر کریں تو معاشرہ میں عفو و درگزر کی رسم چلے گی اور نیکی پھیلے گی اور اگر وہ یہ نیکی خفیہ طور پر کریں گے تو بھی تزکیہ نفوس کا کام ہوگا۔ بھلائی اگر اعلانیہ کی جائے تو بھی مفید ہے اور اگر خفیہ کی جائے تو بھی مفید ہے۔ جب لوگوں کے درمیان عفو و درگزر عام ہوگا تو بدگوئی کرنے کے مواقع خود ہی کم ہوتے چلے جائیں گے بشرطیکہ یہ عفو و درگزر وہ شخص کرے جو انتقام پر قدرت رکھتا ہو۔ لیکن اگر کسی شخص کی کمزوری اسے عفو پر مجبور کر رہی ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ عفو و درگزر اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپناتے ہوئے ہونا چاہیے۔ اللہ قدرت کے باوجود عفو سے کام لیتا ہے۔ (آیت) " (فان اللہ کان عفوا قدیرا) (۴ : ۱۴۹) (اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے حالانکہ وہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے)

اس کے بعد بات کا رخ اہل کتاب کی طرف پھر جاتا ہے۔ پہلے تمام اہل کتاب کے حوالے سے بات ہوتی ہے۔ اس کے بعد خصوصاً یہودیوں کے بعض کارناموں کا تذکرہ ہوتا ہے اور آخر میں نصاریٰ پر تنقید ہوتی ہے۔ یہودی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت مریم (علیہ السلام) کے بارے میں سخت بدگوئی کرتے تھے اور ان کی ذات کے بارے میں بہتان باندھتے تھے۔ اس حصہ کلام میں ان کی ان بدگویوں کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ اس طرح یہودیوں پر کی جانے والی تنقید کا رابطہ دو سابقہ آیات سے بھی واضح ہو جاتا ہے جن میں بدگوئی کی ممانعت کی گئی ہے۔

اہل کتاب اور یہود و نصاریٰ پر یہ تنقید بھی اس معرکے کا حصہ ہے جو مدینہ میں جماعت مسلمہ کو اس کے دشمنوں کے ساتھ درپیش تھا جس کا ایک بہت بڑا حصہ اس سورۃ میں اور سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران میں تفصیلاً بیان ہوا ہے۔ اس معرکے کی تفصیلات قرآنی ترتیب کے مطابق ملاحظہ ہوں۔

150: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کر دیں' اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں

یہودیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اپنے نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالتوں کا انکار کرتے تھے۔ جبکہ نصاریٰ کا موقف یہ تھا کہ وہ صرف حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی رسالت پر ایمان لاتے تھے اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کے وہ بھی منکر تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو الٰہ بھی سمجھتے تھے۔

قرآن کریم نے ان دونوں کے موقف پر سخت گرفت کی۔ اور اللہ اور اس کے انبیاء و رسل پر ایمان لانے کا جامع تصور پیش فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا بھی غلط ہے اور خود اللہ کے تمام رسولوں کے درمیان فرق کر کے بعض پر ایمان لانا اور بعض

کا انکار کرنا بھی غلط ہے بلکہ اللہ اور اللہ کے تمام رسولوں پر بلاامتیاز ایمان لانا ضروری ہے۔ اور یہی دین اسلام ہے اللہ کو اس کے سوا کوئی اور دین قبول نہیں ہے کیونکہ اللہ کی وحدانیت اور اس کے تقاضوں کو صرف اسی صورت میں پورا کیا جاسکتا ہے۔

اللہ کی وحدانیت مطلقہ کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا دین بھی ایک ہو' جس کے حامل وہ تمام رسول قرار دیئے جائیں جو انسان کی ہدایت کیلئے کسی بھی وقت بھیجے گئے ہوں اور جن رسولوں کو یہ امانت سپرد کی گئی ان کا درجہ اور مقام بھی ایک ہونا ضروری ہے۔ رسولوں کے ایک ہی منصب اور ایک ہی مقام کا جو بھی انکار کرے گا وہ اللہ کی توحید کا انکار تصور ہوگا۔ اس سے اللہ کی وحدانیت کا ایک بڑا تصور سامنے آئے گا اس لیے کہ انسانوں کیلئے اللہ کا پسندیدہ دین بہر حال وہی ایک ہے' اس کی بنیاد ایک ہے' اور اس کا مصدر و منبع ایک ہے' لہٰذا اس کے نمائندوں کے درمیان تفریق کس طرح معقول ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم نے اللہ اور رسولوں کے درمیان تفریق کرنے کو ان الفاظ میں بیان کیا۔ "کہ وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور رسولوں کا انکار کرتے ہیں۔" اور رسولوں کے درمیان تفریق کو یوں بیان کیا۔ "ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے۔" اور ان دونوں فریقوں کے بارے میں کہا۔ (آیت) "ان الذین یکفرون باللہ ورسولہ"۔ (۴ : ۱۵۰) (جو لوگ اللہ اور رسولوں سے کفر کرتے ہیں) اس طرح قرآن کے نزدیک اللہ اور رسولوں میں سے کسی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا بھی کفر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان ایک مستقل اکائی ہے اور اس کے ٹکڑے نہیں کئے جاسکتے ایمان کا پہلا قدم اللہ کی وحدانیت کا اقرار ہے۔ اللہ کو وحدہ لا شریک تسلیم کرنے کا لازمی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے انسانوں کیلئے جو نظام زندگی اور جو دین پسند فرمایا ہے وہ بھی ایک ہے جو عقیدہ توحید کی اساس پر ہے۔ جو رسول اس دین کو لیکر آتے رہے ہیں وہ بھی ایک ہیں اس لیے کہ یہ سب اسی کے بھیجے ہوئے ہیں اور یہ خود سے نہیں آئے نہ وہ اللہ کے ارادے اور اس کی وحی سے علیحدہ رہے ہیں۔ ان کا موقف ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اس لیے ایک پوری اکائی کی تحلیل اور تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ جو بھی ایمان کی اس وحدت اور اکائی میں فرق کرے گا وہ کفر مطلق کا ارتکاب کرے گا اگرچہ وہ یہ خیال کرتا ہو کہ بعض اجزاء پر ایمان لایا ہے اور بعض سے کفر کیا ہے۔ ایسے لوگوں کی جزاء اللہ کے نزدیک یہ ہوگی کہ انھیں توہین آمیز عذاب دیا جائے گا ایسے سب لوگوں کو۔

(آیت) "اولئک ھم الکفرون حقا، واعتدنا للکفرین عذابا مھینا"۔ (۴ : ۱۵۱) (وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کیلئے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انھیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی۔) کسی قسم کا تفرقہ جائز نہیں ہے۔ مسلمانوں کے ہاں تمام رسولوں کی عقیدت اور احترام پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک تمام سماوی ادیان برحق ہیں' ہاں اگر ان کے اندر تحریف کر دی جائے تو پھر وہ دین نہ رہیں گے اگرچہ ان ادیان کے بعض حصے اپنی اصل شکل میں موجود ہوں' اس لیے کہ دین ایک ہی وحدت ہے اور اہل کتاب اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ دین میں ایک الہ ہے' اس ایک الہ نے لوگوں کیلئے ایک ہی دین تجویز کیا ہے۔ یہ دین ان کی زندگی کا ایک مکمل منہاج ہے۔ اللہ نے رسولوں کو بھیجا ہے تاکہ یہ تمام رسول اس منہاج اور اس نظام کی طرف لوگوں کو بلائیں۔ مسلمانوں کے تصور میں قافلہ ایمان ایک دوسرے کے ساتھ قطار کی شکل میں جڑا ہوا ہے۔ حضرت

نوح (علیہ السلام) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام)' حضرت عیسیٰ (علیہ السلام)' اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس قافلے کی قیادت فرمارہے ہیں جن کے درمیان ان کی بھائی مزید ایسے رسول بھی گزرے ہیں جن کے نام یہاں مذکور نہیں۔ان تمام رسولوں کا نسب نامہ اسی قافلے کے ساتھ ملتا ہے۔یہ سب ایک ہی عظیم امانت کے حامل رہے ہیں اور یہ تمام رسول ایک ہی سچائی و بھلائی کے وارث رہے ہیں جس کا سلسلہ طویل اور مبارک ہے۔اس سلسلے میں کوئی تفرقہ نہیں ہے' اس میں سے کوئی رسول علیحدہ نہیں ہے اور اس سلسلے کے درمیان کوئی انقطاع نہیں ہے اور دین حق کی وراثت کا مصدر یہی لوگ رہے ہیں ان رسولوں کے سلسلے سے ہٹ کر جو دین اور جو نظریہ بھی ہے وہ باطل اور گمراہی ہے۔

یہ ہے اسلامی نظریہ حیات جس کے سوااللہ تعالیٰ کو کوئی دین اور نظریہ حیات قبول نہیں ہے اور یہ ہیں اہل اسلام جو اپنے اعمال پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر وثواب کے مستحق ہیں اور اس کی جانب سے رحمت اور مغفرت کے بھی مستحق ہیں اگر ان سے اپنی زندگی میں کوئی قصور سرزد ہو گیا۔

151: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ○

وہ سب پکے کافر ہیں اور ایسے کفروں کیلئے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انھیں ذلیل وخوار کر دینے والی ہو گی۔

152: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں' ان کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اسلام نے اللہ اور رسل کے بارے میں عقائد کو ایک اکائی قرار دینے کے بارے میں اس قدر تشدد کیوں کیا؟ اسی لیے کہ ایک مومن کے تصور الہ میں عقیدہ توحید ایک اساسی حیثیت کا حامل ہے۔اور یہ عقیدہ اس کائنات کے اندر ایک مدبر ومنتظم کے تصور کے ساتھ بھی لگا کھاتا ہے جو نہ تعدد کو قبول کرتا ہے اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا منتظم ہو سکتا ہے۔یہی عقیدہ کوئی ذی شعور انسان اختیار کر سکتا ہے جو اس کائنات کے اندر جاری وساری ناموس اکبر کو محسوس کرتا ہے اور جب تک اس کی نظر کو رسائی حاصل ہے۔یہی تصور حیات اہل ایمان کو ایک متحد قافلے کی شکل دے سکتا ہے جو کفر کی صفوں اور حزب الشیطان کی پارٹی کے مقابلے میں' ایک جماعت کی شکل میں کھڑے ہوتے ہیں۔لیکن یہ اہل ایمان ان نظریات کے حامل لوگوں کی طرح متفرق اور بکھرے ہوئے نہیں ہوتے' جن کا دین اور نظریہ اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے تو سماوی تھا مگر انھوں نے اس میں تحریف کر لی اور اب وہ صحیح اہل ایمان کی طرح ایک ہی صف میں کھڑے نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم صرف اسلام کو دین قرار دیتا ہے۔ صرف اہل اسلام کو خیر امت قرار دیتا ہے جسے لوگوں کی خاطر برپا کیا گیا ہے۔ وہ مسلمان جن کا عقیدہ درست ہو' جن کا عمل اور کردار اس عقیدے اور نظریئے کے مطابق ہو' یہ نہ ہو کہ بس وہ ایک مسلمان کے گھر پیدا ہوئے ہوں اور نہ صرف یہ ہو کہ انھوں نے اسلام کے کلمے کو یاد کر لیا ہو اور زبان سے ادا کر دیا ہو۔

اس تشریح و بیان کے بعد معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہیں جو ایک طرف اللہ اور رسولوں میں جدائی کرتے ہیں اور دوسری جانب رسولوں میں سے بعض کو مانتے ہیں اور بعض دوسروں کا انکار کرتے ہیں۔ وہ تاریخی قافلہ ایمانی کے سلسلے کے اندر گیپ پیدا کرتے ہیں' اس وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں جو اللہ نے پیدا کی ہے اور یوں وہ اس وحدانیت کا انکار کر دیتے ہیں جس پر عقیدہ ایمان باللہ قائم ہے۔

رسولوں اور ان کی رسالت کے بارے میں اسلامی تصور حیات کی خشت اول کو مضبوط کرنے کے بعد اور حقیقت ایمان اور حقیقت کفر کو واضح کر دینے کے بعد اس سلسلے میں یہودیوں کے بعض غلط مواقف زیر بحث لائے جاتے ہیں' جن کا تعلق اس بدگوئی سے بھی ہے جس کا ذکر اس پارے کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ اس میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی رسالت کے بارے میں ان کے موقف کی تردید کی جاتی ہے اور اس بات کی مذمت کی جاتی ہے کہ وہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معجزات اور نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے اس موقف اور عقیدے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں اپنے موقف اور عقیدے کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ پھر حضرت مسیح (علیہ السلام) اور ان کی والدہ محترمہ کے بارے میں ان کا موقف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے مختلف ہے۔ حالانکہ ان تمام پیغمبروں کی حقیقت پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی ہے۔ یہاں سیاق کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید جو یہودی اور اہل کتاب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے کھڑے ہیں وہی لوگ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے سامنے بھی کھڑے تھے اور یہی لوگ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے سامنے بھی کھڑے تھے۔ اس سے اس مفہوم کی تاکید مطلوب ہے کہ جس طرح رسل ایک ہیں اسی طرح ہم بھی ایک ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم ان کی اس جبلت کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔

153: يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ○

اے نبی! یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ سے کر چکے۔ اس سے تو انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ پھر انھوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ اس پر بھی ہم نے ان سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو صریح فرمان عطا کیا۔

جزیرۃ العرب میں یہودیوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے مقابلے میں کھلا معاندانہ دشمنی کا موقف اختیار کیا۔ وہ آپ کے خلاف مسلسل خفیہ اور نہایت ہی معاندانہ سازشیں تیار کرتے رہے جن کی تفصیلات کو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ اور جن کے کچھ رنگ ہم سورۃ بقرہ' سورۃ آل عمران اور خود اسی سورۃ کے پارہ پنجم میں دکھا چکے ہیں۔ ان آیات میں جو باتیں کہی جا رہی ہیں وہ بھی ان کے اس مسلسل موقف کا ایک رنگ ہے۔

ان کی پہلی ہٹ دھرمی یہ ہے کہ وہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ آسمانوں سے ایک کتاب نازل فرمادیں' یہ لکھی ہوئی ہو' وہ مجسم طور پر آسمانوں سے ان کے سامنے آ رہی ہو اور وہ اسے اپنے ہاتھوں کے ساتھ چھولیں۔

(آیت) "یسئلک اھل الکتب ان تنزل علیھم کتبا من السمآء (۴ : ۱۵۳) اے نبی! یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ) اس سوال کا جواب' حضرت نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جانب سے خود اللہ تعالیٰ عنایت فرماتے ہیں اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمانوں کے سامنے' یہودیوں کی تردید کرتے ہوئے خود یہودیوں کی اپنی تاریخ سے' ان کا اپنے نجات دہندہ اور قائد اور عظیم نبی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ ان کے رویے کی ایک جھلک پیش فرماتے ہیں۔ حالانکہ ان یہودیوں کا زعم یہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لاتے ہیں اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتے۔۔ ان کی تاریخ کا یہ صفحہ الٹ کر بتایا جاتا ہے کہ ان کی یہ عادت کوئی نئی عادت نہیں ہے۔ موجودہ مدینہ کے یہودی ہی ایسے سوالات نہیں کر رہے بلکہ ازمنہ قدیمہ سے ان کی ایسی ہی عادت رہی ہے۔

ان کی جبلت آج بھی وہی ہے جو عہد موسیٰ میں ہوا کرتی تھی حالانکہ وہ ان کے قائد بھی تھے' نبی بھی تھے اور ان کے نجات دہندہ بھی تھے۔ وہ موٹے دماغ کے لوگ ہیں۔ ان کو صرف محسوس چیزوں کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے۔ جس طرح یہ لوگ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دور میں ہٹ دھرم تھے' عناد کرنیوالے تھے اور ماسوائے اس کے کہ انھیں کسی کی بات کو زبردستی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا جائے' یہ مان کر نہیں دیتے۔ یہ آج بھی ویسے ہی کفر پیشہ اور غدار ہیں اور دوڑ کر وعدہ توڑنے والے ہیں۔ یہ وہی ہیں جھوٹے اور گندے لوگ۔ وہ کسی موقف پر ثابت قدم رہنے والے نہیں ہیں۔ اور نہ ہی یہ لوگ بدگوئی سے چوکتے ہیں۔ یہ ہر وقت لالچ کے بندے ہیں اور دنیا پرستی ان کا شعار ہے۔ لوگوں کے مال باطل اور ناجائز طریقے سے کھانا ان کا وطیرہ ہے۔ یہ بھی ان کی قدیم عادت ہے کہ یہ لوگ اللہ کے حکم سے روگردانی کرتے ہیں اور اس کے ہاں جو ثواب آخرت میں ملتا ہے اسے خاطر ہی میں نہیں لاتے۔

ان آیات میں ان کے خلاف یہ مہم اسی لیے چلائی گئی ہے کہ ان کی حقیقت کھول کر سامنے رکھدی جائے۔ انھیں شرمندہ کر دیا جائے۔ اس مہم کے زور اور اس کے تنوع کو دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت یہودی سازش کو بے نقاب کرنے کی کسی قدر ضرورت تھی جو سازش وہ اسلام اور وقت کے نبی کے خلاف کر رہے تھے۔ یہودیوں کی یہی حیثیت اور ناپاک سازشیں ہیں جو آج تک اس دین اور اس کے ماننے والوں کے خلاف بدستور جاری ہیں۔

(آیت) "یسئلک اھل الکتب ان تنزل علیھم کتبا من السمآء (۴ : ۱۵۳) اے نبی ! یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ) آپ ان کی اس ہٹ دھرمی سے پریشان نہ ہوں' اس لیے کہ ان کی یہ ہٹ دھرمی تعجب انگیز تعجب انگیز نہیں ہے' نہ یہ کوئی نئی بات ہے۔

(آیت) "فقد سالوا موسیٰ اکبر من ذلک فقالوا ارنا اللہ جھرۃ (۴ : ۱۵۳) " (تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ سے کر چکے۔ اس سے تو انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھادو) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جو بیشمار معجزات نازل فرمائے تھے وہ ان کے احساس کو نہ جگا سکے۔ ان عظیم معجزات سے بھی ان کے وجدان کے اندر کوئی ارتعاش پیدا نہ ہوا۔ اور یہ حیران کن معجزات بھی ان کے دلوں کو مائل بہ ہدایت و اطاعت نہ کر سکے اور یہ بد بخت آگے بڑھے اور ذات باری کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کر دیا۔ بالکل کھلے بندوں دیکھنے کا۔ یہ ان کا ایک متکبرانہ مزاج اور مطالبہ تھا' جس میں ایمان کی تروتازگی سرے سے موجود ہی نہ تھی بلکہ ان کی جبلت میں سرے سے ایمان کی استعداد ہی موجود نہ تھی۔

(آیت) " فاخذ تھم الصعقۃ بظلمھم) اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف ہی کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا اور اپنے آپ سے ان کے بارے میں عاجزانہ التماس کو قبول ہی کر لیا۔ اس دعا کی تفصیلات سورۃ اعراف (۱۵۵) میں ہیں۔

(آیت) "فلما اخذ تھم الرجفۃ قال رب لو شئت اھلکتھم من قبل وایای ء اتھلکنا بما فعل السفھآء منا ان ھی الا فتنتک تضل بھا من تشآء وتھدی من تشآء انت ولینا فاغفر لنا وارحمنا وانت خیر الغفرین (۱۵۵) واکتب لنا فی ھذہ الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ انا ھدنا الیک (۱۵۶) (۷ : ۱۵۵۔ ۱۵۶)

جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آپکڑا تو موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا۔ "اے میرے سرکار' آپ تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک) کر سکتے تھے' کیا اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا ہم سب کو ہلاک کر دیں گے ؟ یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی آزمائش تھی جس کے ذریعے سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں۔ ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں۔ پس ہمیں معاف کر دیجئے اور ہم پر رحم فرمایئے۔ آپ سب کو معاف فرمانے والے ہیں۔ اور ہمارے لیے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجئے اور آخرت کی بھی۔ ہم نے ( " آپ کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

(آیت) "ثم اتخذوا العجل من بعد ما جآء تھم البینت "۔ (۴ : ۱۵۳) (پھر انھوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے) یہ بچھڑا سونے کا بنا ہوا تھا۔ اسے سامری نامی شخص نے بنایا تھا۔ یہ اس نے سونے کے ان زیورات سے بنایا تھا' جو انھوں نے مصری عورتوں سے لیے تھے جب وہ وہاں سے نکل رہے تھے۔ یہ لوگ اس بچھڑے کے ارد گرد جمع ہو گئے اور انھوں نے اسے اپنا معبود بنا لیا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اس

وقت کوہ طور پر گئے ہوئے تھے جہاں انھوں نے اپنے رب سے ایک مقررہ وقت میں بات کرنی تھی۔ جہاں ان کو توراۃ کی الواح اور ہدایت اور نئی روشنی عطا ہونی تھی۔ (آیت) " (فعفونا عن ذلک) (اس پر بھی ہم نے ان سے در گزر کیا۔) لیکن یہودی یہودی ہی تو تھے۔ ان کے ساتھ معاملات کرنے میں صرف خوف اور جبر مفید رہتا ہے۔

(آیت) " واتینا موسیٰ سلطنا مبینا (۱۵۳) ورفعنا فوقھم الطور بمیثاقھم وقلنا لھم ادخلوا الباب سجدا وقلنا لھم لا تعدوا فی السبت واخذ نا منھم میثا قا غلیظا" (۱۵۴) (۴: ۱۵۳۔ ۱۵۴) (ہم نے ان سے در گزر کیا۔ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو صریح فرمان عطا کیا اور ان لوگوں پر طور کو اٹھا کر ان سے اس فرمان کی اطاعت کا عہد لیا۔ ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو۔ ہم نے ان سے کہا کہ اللہ کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے پختہ عہد لیا۔)

یہاں سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے جو سلطان عطا فرمایا وہ کیا چیز ہے۔ غالباً وہ وہی شریعت ہے جو الواح میں موجود تھی' تو اللہ تعالیٰ کی شریعت گویا اللہ کی جانب سے سلطان اور حاکمیت ہے اور اللہ کے سوا جو شریعت اور قانون بھی ہو گا اس پر اللہ کی جانب سے کوئی سلطان اور سند قبولیت نہ ہو گی۔ عملاً بھی غیر اللہ کی شریعت اور قوانین کو دلوں پر کوئی حکمرانی حاصل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے لیے جو قوانین خود بناتے ہیں ان کی کوئی وقعت عوام الناس کے دلوں میں نہیں ہوتی۔ ان قوانین کا نفاذ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ داروغہ سر پر کھڑا ہو یا جلاد کی تلوار سر پر ہو۔ رہی اللہ کی شریعت تو لوگ اس کے سامنے نہایت ہی عاجزی سے سر تسلیم خم کرتے ہیں اور ان کے دل مائل باطاعت ہوتے ہیں۔ دلوں کے اندر شریعت کے خلاف ورزی کا خوف ہوتا ہے اور اللہ کی سزا کا ڈر نظروں میں ہوتا ہے۔ لیکن یہودی جن کے دل شعور ایمان سے محروم تھے انھوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ کی جانب سے دی گئی الواح شریعت کے ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس مقام پر پھر ان پر اللہ کا غضب آتا ہے' اس لیے کہ وہ اپنی فطرت اور اپنے مزاج کے اعتبار سے اس کے لائق تھے۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ ایک عظیم چٹان ان کے سروں پر لٹک رہی ہے۔ یوں نظر آتا تھا کہ ابھی ان کے سروں پر گری کہ گری۔ وہ چونکے فوراً انھوں نے اس شریعت کو تسلیم کرنے کا اقرار کیا اور وعدہ کر لیا۔ پختہ میثاق طے ہو گیا۔ اور بڑی بڑی یقین دہانیوں کے ساتھ طے ہو گیا۔ حالانکہ پہلے وہ نہ تسلیم کرنے تھے نہ عہد کرنے کیلئے تیار تھے اور نہ ہی اس عہد قدیم کو لینے کے لیے تیار تھے۔۔ اللہ تعالیٰ یہاں انھیں ان کی اس صفت قدیمہ کو یاد دلاتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اس منظر میں ایک سخت پتھر جو ان کے سروں پر لٹک رہا تھا اور دوسری طرف ان کے سینوں میں سخت پتھر کی طرح دل رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس منظر میں ان دو قسم کے پتھروں کے درمیان مناسبت پیدا کر دی گئی ہے۔ اس طرح انداز تعبیر پختہ' متعین اور مجسم ہو جاتا ہے۔ جس طرح قرآن کریم کا عمومی انداز تعبیر ہے کہ وہ وہ بیت المقدس میں سجدہ ریز ہو کر داخل ہوں اور یہ کہ وہ سبت کا احترام کریں جسے خود ان کے مطالبے پر ان کیلئے خوشی کا دن بنایا گیا تھا۔

لیکن ہوا کیا؟ پتھر لٹکنے کے خوف وہراس کے غائب ہوتے ہی اور اس قاہرانہ فضا کے ختم ہوتے ہی ان کے قدم پھسل گئے اور فخر سے یہ کہنے لگے کہ ہمارے دل تو کسی نصیحت سے متاثر نہیں ہوتے۔ وہ مردوں میں ہیں اور ان تک کوئی بات پہنچتی ہی نہیں ہے کیونکہ ان کے دروازے بند ہیں۔ اور یہ کہنے کے بعد انھوں نے ان تمام برے افعال کا ارتکاب کیا جس کی تفصیلات اللہ میاں یہاں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بتاتے ہیں۔ یہ یہاں اس لیے گنوائے گئے ہیں تاکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہودیوں کو ذرا آئینہ دکھادیں کہ وہ ہیں کیا؟

154: وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۱۵۴

اور ان لوگوں پر طور کو اٹھا کر ان سے اس فرمان کی اطاعت کا عہد لیا۔ ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو۔